دکنی مثنویوں میں مشترکہ تہذیب وتمدن کی عکاسی

کفایت حسین

شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی۔180006، موبائل: 9086356185

دکن میں تقریباً تمام شعرا نے صنفِ مثنوی پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ شاعری کی اس بیانیہ صنف کے معیار کو بلند کیا ہے اور اس کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ان مثنویوں کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ان میں اخلاق و موعظت، فلسفہ وتصوف، مذہبی تعلیم، حسن وعشق کی داستانیں، میدان کارزار کے ہنگامے اور زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کے علاوہ مشترکہ تہذیب وتمدن کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

ہم جب مشترکہ تہذیب و کلچر کی بات کرتے ہیں تو اس سے وہ ذہنی نظریات ورجحانات مراد ہوتے ہیں جن کے ذریعے ہم اپنے ملک کی زمین، اس کے پہاڑ، اس کی ندیاں، اس میں بسنے والے مختلف مذاہب کے لوگ، ان کا رہن سہن، طور طریقے، رنگ ونسل، ان کی زبان وادب سے محبت اور مساوات و یکسانیت ہی پیدا کرنا نہیں بلکہ تہذیب وکلچر کے مختلف عناصر کی نیرنگی میں یک رنگی لانا لازمی ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے ہم اپنے ملک وقوم کی بقا وتحفظ اور اس کی عزت وعظمت کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔حقیقتاً مشترکہ تہذیب وکلچر نہ صرف حکومت وریاست کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہے بلکہ رنگ، مذہب، نسل، فرقے اور گروہ وغیرہ سے بالاتر ہے۔اس کا اصل مقصد افراد کی خوشحالی اور بقاو بہبود ہے۔

ہندوستان میں مشترکہ تہذیب وتمدن کی بنیاد عربوں کی آمد سے پہلے ہی پڑ چکی تھی البتہ عربوں نے اسے اور زیادہ مستحکم ومضبوط کیا۔عرب تاجروں نے جب جنوبی ہند کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس وقت ہندوستان پر دراوڑیوں، آریاؤں اور یونانیوں کا پرچم لہرا رہا تھا۔عربوں کی تہذیب ومعاشرت یہاں کے کلچر سے قدرے مختلف تھی، لیکن رفتہ رفتہ دونوں فرقوں نے اپنے مسائل حل کرنے کی یہی صورت زیادہ مناسب سمجھی کہ ایک مشترکہ کلچر بنایا جائے۔اس کلچر کے فروغ پاتے ہی ایک ایسی زبان معرض وجود میں آئی جس سے دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں مدد ملی۔علاوہ ازیں بعد کو جب دکنی حکومت مستقل طور پر قائم ہوئی تو وہاں کے حکمرانوں نے اپنے ہاں عربی اور فارسی کے جید علما و فضلا کو اعلیٰ منصب پر فائز کیا۔اس طرح عربی اور فارسی کی آمیزش سے ایک نئی زبان بنی۔جسے اس دور میں ہندی، ہندوی یا دکنی (اردو) کہا جاتا تھا۔زبان کی اسی آمیزش کی طرف علی جواد زیدی نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس میں سنسکرت نے اپنا رس گھولا ہے، برج بھاشا، کھڑی، اودھی، مراٹھی، گجراتی، تلگو، بنگالی، سندھی، پنجابی، پشتو، فارسی، ترکی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، لاطینی، یونانی اور روسی نے اپنا بانک پن اور اپنی عظمت ووسعت سموئی ہے۔''

(اردو میں یکجہتی کی روایت از علی جواد زیدی، ص:۱۴۴)

ہندوستان کے تہذیبی اشتراک میں سب سے اہم کام صوفی سنتوں نے کیا۔اسی طرح دکنی زبان کی نشو ونما اور مشترکہ تہذیب کے فروغ میں بہمنی سلاطین اور اس دور کے صوفیائے کرام کا اہم حصّہ ہے۔دکن کی سرزمین کو سرسبز و شاداب کرنے والی قوموں نے اپنے رسم ورواج، ادب ومعاشرت، لباس و زیورات اور فلسفے کے اشتراک کے ذریعہ بھی مختلف نسلوں اور مذاہب کے ماننے والوں کو ہم آہنگ وہم خیال کیا۔ان صوفیائے کرام میں پہلا نام خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۴۲۲ء۔۱۳۲۱ء) کا ہے جن کی نثر ونظم دونوں کے نمونے موجود ہیں۔خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی نثر کا نمونہ جس سے قدیم اردو نثر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ملاحظہ فرمائیں ایک اقتباس جس میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ اگر انسان اپنے نفس کو پہچان لے تو پھر وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ باہم زندگی گزارنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔

''انسان کے بوجنے کو پانچ تن۔ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں ہور پانچ دربان، پہلا تن واجب الود، مقام اس کا شیطان، نفس اس کا اجارہ، یعنی واجب کی انک سوں غیر نہ دکھنا سو، حرص کے کان سوں غیر نہ سننا سو، حسد نک سوں بد بوی نہ لینا سو۔پیر طبیب کامل ہونا، نبض پچھان کر دوا دینا۔''

(مشمولہ دکنی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ص۱۲)

اس دور کی جو سب سے قدیم مثنوی دستیاب ہوئی ہے وہ فخر الدین نظامی کی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے۔اردو زبان کی یہ مثنوی احمد شاہ ولی بہمنی کے دورِ حکومت (۱۴۳۸ء۔۱۴۲۱ء) میں لکھی گئی۔''کدم راؤ پدم راؤ'' نہ صرف اردو زبان کی پہلی مثنوی ہونے کے اعتبار سے درجۂ امتیاز رکھتی ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس کے مطالعہ سے اس دور میں لوگوں کے رسم ورواج، تہذیب و معاشرت، اخلاق وآداب اور خیالات وتصورات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔نظامی نے مثنوی میں بادشاہِ وقت کی تعریف اس طرح کی ہے:

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار
پرتپال سنسار کرتار ادھار
دھنی تاج کا کون راجہ ابھنگ
کنورشاہ کا شاہ احمد بھجنگ

مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کی زبان بھی دکن کی مشترکہ تہذیب کی خوب صورت مثال ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

''وہ قدیم زبان جو اس مثنوی میں استعمال ہوئی ہے۔ اس میں صدیوں کے میل جول سے متعدد زبانوں کا خون شامل ہے اور اسی خاندانی شباہت کی وجہ سے مختلف زبانیں بولنے والے اسے اپنی زبان سے قریب تر پاتے ہیں۔''

(ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو جلد اول، ص:۳۶)

اس عہد کی ایک اور مثنوی اشرف بیابانی کی ''نوسرہار'' ہے۔ یہ ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے بعد سب سے قدیم مثنوی ہے۔ گرچہ ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں غیر مذہبی قصہ پیش ہوا ہے تو ''نوسرہار'' کا موضوع خالص مذہبی نوعیت کا ہے۔ یہ مثنوی ۱۵۰۳ء میں لکھی گئی۔ اس میں کربلا کے واقعات پیش کیے گئے ہیں، جن کو نو ابواب اور بیس فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کا خیال درست ہے:

''اشرف کی نوسرہار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اشرف کو ایک کمزور اور نوخیز زبان میں بھی اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔''

اشرف کو بات کہنے کا ڈھنگ اور مختلف جذبات و خیالات کی ترسیل کا انداز اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کی تہذیب و معاشرت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں نمونہ کلام:

سونے کی جیو کھونٹی گھڑ
مانک موتی ہیرے جڑ
بند پروے سو نے تار
سچیں ہوا نو سر ہار

نظامی اور اشرف کے بعد میراں جی شمس العشاق نے اپنی نظموں کے ذریعہ ہدایت و تلقین کا کام سرانجام دیا۔ ''خوش نامہ''، ''خوش نغز''، ''شہادت التحقیق''، اور ''مغز مرغوب'' ان کے صوفیانہ خیالات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ میراں جی نے ہندوستانی روایات سے اثر قبول کیا اور ہندوستانی مزاج کو مدنظر رکھ کر اپنی تخلیقات پیش کیں، جس سے عوام میں اخوت، بھائی چارہ اور اتفاق کی بنیاد پڑی۔ مثنوی ''خوش نامہ'' میں ایک نوجوان لڑکی خوش یا خوشنودی کا قصہ بیان ہوا ہے۔ جو شاہ پور میں سترہ سال کی عمر میں انتقال کر گئی۔ وہ بھولی بھالی اور سب کی پیاری تھی، دوسری لڑکیوں کی طرح شوخ و شنگ نہ تھی اور بناؤ سنگار کی جگہ خدا کی لگن لگی تھی۔ خدا پر اس کے کامل یقین کو میراں جی یوں بیان کرتے ہیں:

یہ سب عالم تیرا
رزاق سبھو کیرا
تجھ بن اور نہ کوئے
نا خالق دو جا ہوئے
جے تیرا ہو کرم
تو ٹوٹے سبھی بھرم

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ خود مختار سلطنتیں وجود میں آئیں۔ بیجاپور میں عادل شاہی، گولکنڈہ میں قطب شاہی، احمد نگر میں نظام شاہی، بیدر میں برید شاہی اور برار میں عماد شاہی۔ سوائے عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے باقی تمام حکومتیں زیادہ دیر قائم نہ رہ سکیں۔ ان دونوں سلطنتوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور اس زبان کے صحت مند عناصر کے ساتھ مشترکہ تہذیب و تمدن کو بڑھاوا دینے میں بھی اہم حصّہ لیا۔

عادل شاہی عہد: (۱۴۹۰ء تا ۱۶۸۶ء)

عادل شاہی سلطنت کی بنیاد ۱۴۹۰ء میں پڑی۔ اس کا بانی یوسف عادل خان تھا۔ جب بہمنی سلطنت کے مختلف صوبے آزاد ہوتے چلے گئے تو اس نے بیجاپور کو اپنا پایہ تخت بنا کر خود مختار حکومت کا اعلان کیا۔ عادل شاہی اقتدار تقریباً دوسو برس تک قائم رہا اور نو بادشاہوں نے حکومت کی۔ ۱۶۸۶ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے بیجاپور فتح کر کے ہمیشہ کے لیے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

عادل شاہی عہد کی ادب نوازی اور علم پروری روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ان سلاطین کی ادب پروری اور علم دوستی کا اندازہ ہارون خان شروانی کی اس عبارت سے بخوبی ہوتا ہے:

''وہ نہ صرف ہندو اور مسلمان علما کی فلسفیانہ اور علمی گفتگو سے محظوظ اور مستفید ہوتے تھے بلکہ گورا کے کیتھولک علما کو بھی طلب کرتے تھے اور انھیں اپنے سامنے خیالات کے اظہار کی آزادی دینے میں تامل نہیں کرتے تھے۔'' (ہارون خان شروانی، دکنی کلچر، ص:۳۹)

ان لوگوں نے اردو شعر و ادب کی سرپرستی کی اور اردو زبان کو اتنے اعلیٰ مقام پر فائز کیا کہ سرکاری اور دفتری کام کاج بھی اسی زبان میں ہونے لگے۔ اس دور کی ادبی سرگرمیوں پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے لکھا ہے:

''اس دور کی ادبی سرگرمیاں بادشاہ کی دلچسپی کے علاوہ ان کے وزیر افضل خان شیرازی کی فیاضی کی بھی رہین منت ہیں....اس نے بیجا پور کو عالم و فاضل کا مرکز بنانے کی خاطر لاکھوں روپے صرف کیے۔''

(ڈاکٹر محی الدین قادری زور، دکنی ادب کی تاریخ، ص:۲۲)

مذکرہ بالا قول میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بیجاپور کے بادشاہوں نے مشترکہ کلچر کے فروغ کے لیے فارسی نژاد وزرا، علما اور فضلا کو اپنے

دو بار میں جگہ دی اور ان اہلِ کمال حضرات نے دکن کے مختلف تہذیبی، ادبی اور لسانی علاقوں کو متحد کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔

دبستان بیجاپور کی اولین شعری کاوشوں میں برہان الدین جانمؔ کی منظومات آتی ہیں۔ان میں ''وصیت الہادی''، ''بشارت الذکر''، ''سکھ سہیلا''، ''منفعت الایمان اور ارشادنامہ'' قابل ذکر ہیں۔

''ارشادنامہ'' ڈھائی ہزار اشعار کی ایک طویل مثنوی ہے جس میں اپنے والد و مرشد کی مدح کچھ اس طرح کی ہے:

صفت کروں کچھ اپنا پیر
جس تھے روشن ہوئے ضمیر
پیر میراں جی شمس العشاق
دھوں جگ رب تجھ کیا کشاف

برہان الدین جانمؔ نے تصوف کو اپنا خاص موضوع بنایا مگر شیو جی اور کرشن جی کا دامن بھی تھامے رکھا۔ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی شاعری مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار ہے:

موج کر لیو کپٹ اپنا رے لال
بن شیو میرا کوئی نا کرے سنجال

ابراہیم عادل شاہ ثانی، عادل شاہی عہد کا ایک باکمال حکمران گزرا ہے جس نے ''جگت گرو'' کے لقب سے شہرت حاصل کی۔رقص و موسیقی میں اسے کمال حاصل تھا۔اس کے گیتوں کے مجموعے کا نام ''نورس'' ہے جس میں سترہ راگوں کے تحت سترہ دوہے اور انسٹھ گیت شامل ہیں۔ابراہیم عادل شاہ ثانی نے علما و فضلا کی قدردانی میں بڑی فیاضی سے کام لیا، جس کی وجہ سے اس کے عہد حکومت میں محمد قاسم فرشتہ، رفیع الدین شیرازی، ملاظہوری، ابوطالب کلیم اور شیخ علیم اللہ محدث جیسے اہلِ کمال و فن نے فروغ ادب میں اپنا بھرپور تعاون دیا۔

عادل شاہ ثانی ہندی ادب کے مقبول و مشہور دیومالائی عناصر اور ہندو سادھو سنتوں کے طریقۂ عبادت سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔''نورس'' کی ابتدا سرسوتی وندنا سے ہوتی ہے:

نورس سود جگ جگ جوتی اترا سروگنی
پوست سرستی ماتا، ابراہیم پر سادھی دونی

عبدلؔ ''جگت گرو'' کا درباری شاعر تھا۔اس نے بادشاہِ وقت کے حالات پر ایک طویل مثنوی ''ابراہیم نامہ'' (۱۶۰۲ء) لکھی۔عبدلؔ کو بادشاہ نے حکم دیا کہ نئے مضمون کی ایک ایسی کتاب لکھ جس کا جواب کسی سے نہ بن پڑے۔عبدلؔ نے بادشاہ سے دریافت کیا ''کس زبان میں لکھوں کہ میں سوائے ہندوی یا دیلوی کے کوئی اور زبان عرب یا عجم نہیں جانتا۔'' تو بادشاہ نے جواب دیا ''جس زبان میں چاہے لکھو، فنِ شعر کی خوبیاں اور عشق کے اسرار تو ہر زبان میں محفوظ رہتے ہیں، اور پرکھنے والے جوہر کو خواہ کسی رنگ و روپ میں ہوں پرکھ لیتے ہیں۔'' عبدلؔ کی زبان پر ہندی کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ملاحظہ ہوں چند اشعار:

اوہی شاہ استاد کر سو نظر
بلایا جوں عبدلؔ کوں سر ہات دھر
نوی بات مضمون کر اک کتاب
نہ کوئی فکر گوندھیا ہے تس کا جواب
نہ باقی رہے کچھ تو عالم نشاں
اگر کچھ رہے بچن شعر جاں

اس مثنوی میں اس عہد و معاشرت کی زندگی کے خدوخال نہ صرف نمایاں ہیں بلکہ دو تہذیبوں، زبانوں اور عقیدوں کے اشتراک کا بھی واضح طور پر اثر دکھائی دیتا ہے۔

عادل شاہی عہد کے ایک اور شاعر مرزا محمد مقیم مقیمیؔ نے فارسی کے ساتھ دکنی میں بھی شاعری کی ہے۔''فتح نامہ بکھیری'' میں ہندی اثرات نمایاں ہیں۔زبان کے علاوہ عقائد و عادات اور اطوار میں بھی اشتراکِ کلچر پایا جاتا ہے۔مقیمیؔ نے ایک اور مثنوی ''چندر بدن و مہیار'' (۱۶۳۸ء) کے نام سے تحریر کی۔اس مثنوی کا ہیرو مہیار ترک تاجر کا بیٹا ہوتے ہوئے ایک ہندو راجکماری چندر بدن کے عشق کے جال میں گرفتار ہو جاتا ہے۔چندر بدن کے لاکھ سمجھانے کے باوجود کہ ہندو مسلم میں رشتہ ناممکن ہے، وہ نہیں مانتا، لیکن مہیار کا ایمان ہے کہ عشق ایک ایسا جذبہ ہے، ایک ایسی آگ ہے جس کی تپش اور کسک ذات پات کے حقیر سے جذبے کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔مہیار کے جوش و جذبے سے متاثر ہو کر چندر بدن بھی اسلام قبول کر لیتی ہے، لیکن دنیا میں عشق کو وصال کے بجائے فراق ہی نصیب ہوا ہے۔جب ہیر اور ہیروئن موت کی آغوش میں چین کی نیند سو جاتے ہیں تب ظالم دنیا کی آنکھیں کھلتی ہیں اور انھیں ایک ہی کفن اور ایک ہی قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔مقیمیؔ نے قصہ یوں پیش کیا ہے کہ عشق کے خوش رنگ پھول اور اتحاد و اتفاق کی فضا پوری مثنوی پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے:

پرت کی ندی نت ابلتی رہے
پرت سونچ دنیا یوں چلتی رہے

امینؔ، مقیمیؔ کا ہم عصر تھا۔اس نے ایک مثنوی ''بہرام و حسن بانو'' لکھی ہے۔جس میں شادی کا سماں کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس دور کی تہذیب و معاشرت کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔مہمانوں کی آمد یا کسی خاص موقع پر آرائش و زیبائش کا اہتمام کس انداز سے کیا جاتا تھا۔ملاحظہ ہو اس کی ایک مثال:

کیا فرش زریں سو ہر ٹھار پر
بنائے محل سارے گلزار پر
بچھے قالیناں بیچ ایوان کے
دھرے تکیے بغل بڑی شان کے

اس عہد میں حسن شوقیؔ کی دو مثنویاں ''فتح نامہ نظام شاہ'' اور میز بانی نامہ'' ملتی ہیں۔''فتح نامہ نظام شاہ'' تالی کوٹہ کی جنگ کے موقع پر لکھی گئی اور دوسری نواب مظفر خان کی لڑکی سے سلطان محمد عادل شاہ کی شادی کے موقع پر۔''فتح

نامہ'' میں شوقی نے مختلف واقعات کی کامیاب تصویر کشی کے ساتھ شاہی فوج میں شامل مختلف اقوام کے افراد کی شمولیت کو اس طرح اجاگر کیا ہے:

بہر شہر و کشور تے غازی چلے
چغتے، مغل، ترک و تازی چلے
پس و پیش سیدے چلے تاولے
چپ و راست افغان رن باولے

مثنوی ''میز بانی نامہ'' میں جس رشتے کا واقعہ نظم کیا گیا ہے اس سے دبستان گولکنڈہ اور بیجاپور کی تہذیب ومعاشرت اور ادب میں بھی گہرا ربط پیدا ہوا۔ عبداللہ قطب شاہ کی بہن خدیجہ سلطان اور محمد عادل شاہ کی شادی سے بیجاپور اور گولکنڈہ کا رشتہ اور زیادہ گہرا اور مضبوط ہوگیا۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

''اس تصویر میں ہندو مسلم ثقافت کے وہ نقوش نظر آتے ہیں جو مغلیہ دور میں ملک گیر سطح پر اپنے عروج کو پہنچے۔ یہ وہ عناصر ہیں جن میں ہندوی مزاج وتہذیب مسلمانوں کے رنگ میں رنگ کر ایک نئے نقش ونگار اور تہذیبی قوت کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ جس میں اس زمانے کے کلچر کی مثبت قدریں بھی تھیں اور مسلمانوں کی ترقی پذیر تہذیبی قوت بھی۔''

(ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص: ۲۸۷۔۲۸۸)

ملک خوشنود عادل شاہی عہد کا ایک اور اہم شاعر گزرا ہے۔ اس نے سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش پر مثنوی ''جنت سنگار'' لکھی۔ جس میں بہرام گور کی داستان کو نظم کیا گیا ہے۔ ملک خوشنود گولکنڈہ کا رہنے والا ایک غلام تھا جسے خدیجہ سلطان کے جہیز میں شہزادی کے ساتھ گولکنڈہ سے بیجاپور روانہ کیا گیا۔ اس کی دیگر مثنویوں میں ''بازارِ حسن''، ''یوسف زلیخا'' اور ''ہشت بہشت'' اہم ہیں۔ مثنوی ''ہشت بہشت'' میں دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تمام مذاہب اس امر میں متفق ہیں کہ اس دنیا کی ہر شے کو فنا ہونا ہے، باقی رہنے والی شے محبت اور انسانیت ہے جس میں تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے۔ ''ہشت بہشت'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عجب بے مہر دنیا بے وفا ہے
محبت عین اس کا سبب جفا ہے
ملے ہیں باپ بھائی سب مراٹی
ولے کوئی گور میں ہرگز نہ آسی
چلے جوں نیک مرداں چل تو خوشنود
خدا حاصل کریں گا دل کا مقصود

اس دور کی سب سے بڑی مثنوی کمال خان رستمی کی ''خاور نامہ'' ہے جو ابن جسام کی فارسی مثنوی کا دکنی میں آزاد ترجمہ ہے۔ چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل یہ مثنوی ۱۶۴۹ء میں لکھی گئی۔ دراصل خدیجہ سلطان نے ایک اعلان کیا تھا کہ جو بھی ابن جسام کی فارسی مثنوی کا دکنی میں ترجمہ کرے گا بڑا انعام حاصل کرے گا۔ رستمی نے یہ کارنامہ انجام دے کر انعام حاصل کیا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس دور میں مشترکہ تہذیب وثقافت کو محفوظ کرنے کے لیے کس طرح کے اقدامات اٹھائے جاتے تھے۔ سبب تالیف کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فلک کوں وفاداری اندیشہ نیں
بغیر از جفا اس کوں کچھ پیشہ نیں
اتھی خوب یوں زندگی ہور ہوس
اگر مرگ کا ڈر نہ ہوتا زپس
اسی نامہ سوں نام مج ہوئے بلند
ہوئے خلق بھی اس تے بہرہ مند

نصرتی عادل شاہی عہد کا سب سے بڑا شاعر اور ''ملک الشعرا'' تھا۔ اس نے تین مثنویاں لکھی ہیں۔ ''گلشن عشق'' (۱۶۵۷ء)، ''علی نامہ'' (۱۶۶۵ء) اور ''تاریخ اسکندری'' (۱۶۷۲ء)۔ نصرتی کا دیوان ڈاکٹر جمیل جالبی نے مرتب کر کے شائع کیا جس میں یہ تینوں مثنویاں شامل ہیں۔ ''گلشن عشق'' ایک عشقیہ مثنوی ہے جسے ملا عبدالصمد کی فرمائش پر تحریر کیا گیا۔ اس میں منوہر اور مدمالتی کی داستان عشق بیان ہوئی ہے۔ ''گلشن عشق'' میں ہندو روایتوں کی مدد سے ایک پریم کتھا بیان کی گئی ہے۔ دلفریب اور خوشنما مقامی رسم ورواج کی رنگینی اور دلچسپی سے محظوظ ہوتے ہوئے مدمالتی کا منوہر سے نکاح مسلم طرز پر ہوتا ہے۔ قصے میں پیش آنے والے واقعات بھی ہندی روایات وتصورات سے ماخوذ ہیں، جیسے وکرم راجہ کا خیرات دینے پر سنیاسی کا یہ کہنا کہ لاولاد سے دان لینا پاپ ہے، سنیاسی کے دیے پھل کھانے سے بچے کی ولادت، گلاب چھڑکنے سے چڑیا بن جانا، پھر جادو کے زور سے انسان بننا، غرض مثنوی کی پوری فضا ہندو دیومالائی ہے اور رنگِ سخن ہندی روایات سے قریب ہے۔ ''گلشن عشق'' کے متعلق خود نصرتی نے کہا ہے:

معانی کی صورت کی ہے آرسی
کہیا شعر دکھن جوں فارسی

مجموعی حیثیت سے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ''گلشن عشق'' واقعی اشتراک ہے، دو زبانوں کا، دو تہذیبوں کا، دو قوموں کے عقیدت مندوں اور دو روایات کا۔

''علی نامہ'' اور ''تاریخ اسکندری'' میں مغلوں اور مرہٹوں کے خلاف بیجاپوری (ہندو مسلم) شجاع کاندھے سے کاندھا ملا کر دل وجان سے اپنے وطن کی حفاظت کی خاطر مصروف جنگ ہیں۔ ''علی نامہ'' میں فوجوں کے حملہ دکن کا منظر اس طرح پیش کیا گیا ہے:

کتا ہوں اتا فوج دلی کی بات
چلی تھی دکن دل پہ کس دھات سات
ہتیاں کا عرابہ چلے میل میل
اتھا جس میں سردار اصحاب فیل

نصرتی کی طرح ہاشمی نے بھی ادب کا فنی معیار قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ

فارسی آمیز اردو کا استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کی مثنوی ''یوسف زلیخا'' پر دکنی اردو کا گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ ہاشمی کی زبان دکنی اور ایرانی کی حسین آمیزش سے وجود میں آئی۔ ہاشمی کی قادرالکلامی کا ثبوت یہ ہے کہ پیدائشی اندھا ہونے کے باوجود اردو شاعری میں ریختی کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا اعزاز اسی کو حاصل ہے۔ ان کی شاعری پر ہندی کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو نمونہ کلام:

سجن آویں تو پردے سے نکل کر بار بیٹھوں گی
بہانہ کر کے موتیاں کا پرونے ہار بیٹھوں گی

نصرتی اور ہاشمی کے معاصر محمد امین ایاغی بھی تھے۔ ان کی مثنوی ''نجات نامہ'' گرچہ بادشاہ علی عادل شاہ کو پند و نصائح کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی لیکن اس مثنوی میں ایاغی نے پوری انسانی برادری کی فلاح و بہبود چاہی ہے اسی وجہ سے ان کی شاعری ہندو مسلم اتحاد کی آئینہ دار ہے۔

قطب شاہی عہد: (۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۷ء)

قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ تھا۔ اس نے ۱۵۱۸ء میں خود مختار حکومت قائم کی اور گولکنڈہ کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے آٹھ حکمران گزرے۔ ۱۶۸۷ء میں مغل بادشاہ اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو فتح کر کے یہ سلطنت اپنی قلمرو میں شامل کر لی تھی۔ سلطان قلی نے چوں کہ خود مختار سلطنت تلنگانہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس لیے ساری عمر اپنی سلطنت کو مضبوط و مستحکم بنانے کے منصوبوں میں گزار دی، لیکن انھوں نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ رعایا دو حصّوں میں تقسیم نہ ہونے پائے۔ اس لیے ہندو مسلم تہذیب سے خود کو وابستہ رکھا۔ بقول ہارون خان شروانی:

''اس کی ملکی پالیسی کا شاید سب سے بڑا عنصر اس کا وہ اعتماد تھا جو اسے اپنی رعایا کے سربرآوردہ اشخاص پر تھا اور اس اعتماد میں اس نے کبھی مسلم غیر مسلم کے درمیان فرق نہیں کیا۔''

(ہارون خان شروانی، دکنی کلچر، ص: ۴۳)

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قرابت، اخوت، بھائی چارہ اور اتحاد قطب شاہی حکمراں محمد قلی قطب شاہ، سلطان قطب شاہ اور ابراہیم قطب شاہ نے پیدا کیا۔ دکنی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلم بادشاہوں نے اپنے دور حکومت میں کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مشترکہ تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالی اور ہندوؤں کو اعلیٰ منصب سے نوازا۔ بہمنی اور عادل شاہی حکمرانوں کی طرح قطب شاہی حکمرانوں نے بھی اس اتحاد کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ بقول جمال کسٹر پوری:

''قطب شاہی دور نہ صرف دکن کے لیے بلکہ سارے بھارت کے لیے قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی اور مشترکہ قومیت کا ایک اعلیٰ اور ان مٹ نمونہ پیش کرتا ہے۔''

(جمال کسٹر پوری، قطب شاہی دور میں تلگو کی سرپرستی، مشمولہ دبستان گولکنڈہ، ص: ۱۵۸)

ابراہیم قطب شاہ کی وفات کے بعد اردو شعر و ادب نے ترقی و ترویج کے کئی مدارج طے کیے اور اس میں بالخصوص محمد قلی قطب شاہ کی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ دبستان گولکنڈہ کا ایک اہم حکمران اور نامور شاعر و ادیب گزرا ہے۔ اردو ادب کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی اسی کو حاصل ہے۔ یہ حکمران باریں پیاریوں کے نام سے بھی مشہور ہے، اس کا اردو کلام پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اردو شاعری کی مختلف اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور رباعی وغیرہ میں اس نے طبع آزمائی کی اور اپنی قادرالکلامی کے جوہر دکھائے۔ اس کی شاعری میں مشترکہ تہذیب و تمدن کے عناصر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

ہمارا سجن خوش نظر باز ہے
تو اس دل میں سب عشق کا راز ہے
گلے ہات دے کھیلے ناریاں سو کھیل
جسوں کھیلے پیو او سرفراز ہے

احمد گجراتی کی مثنوی ''یوسف زلیخا'' کو دبستان گولکنڈہ کی پہلی ادبی کاوش کہا جاتا ہے۔ احمد گجراتی، گجرات کا رہنے والا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ نے اسے خط لکھ کر گولکنڈہ مدعو کیا۔ احمد گجراتی کی یہ مثنوی مقامی تہذیب و معاشرت کے علاوہ فنی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس کے بعد اسد اللہ وجہی، قطب شاہی عہد کا بہت بڑا شاعر اور ادیب گزرا ہے۔ یہ گولکنڈہ کا پہلا ''ملک الشعرا'' تھا۔ اس نے بادشاہ وقت کے عشق کی داستان کو اپنی مثنوی ''قطب مشتری'' میں پیش کیا ہے۔ اس مثنوی میں جو قصہ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ بادشاہ زمانہ شہزادگی میں ایک ہندو بھاگ متی نام کی حسینہ سے عشق کرنے لگتا ہے اور چھپ چھپ کر اس سے ملاقاتیں کرتا ہے۔ والد کو جب اس کے عشق کا راز معلوم ہوتا ہے تو پہلے اسے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر ایک بار جب اپنی محبوبہ سے ملاقات کے لیے شہزادے نے گھوڑے کو طوفانی دریا میں ڈال دیا تو باپ کی محبت نے جوش مارا۔ دریائے موسیٰ پر پُل بنوا دیا تا کہ شہزادہ اس پار جا کر بھاگ متی سے ملاقات کر سکے۔ تخت شاہی پر بیٹھنے کے بعد محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ متی کو حرم میں داخل کر کے ''مشتری'' کے خطاب سے نوازا۔ مثنوی ''قطب مشتری'' کے دیباچہ میں وجہی اپنے کلام کی بڑائی اس طرح ظاہر کرتا ہے:

نہ پہنچے نہ پہنچا ہے گن گیان میں
سو طو طی منج ایسا ہندوستان میں

سید مجاور حسین نے اس کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اس مثنوی کی اہمیت اسی لیے ہے کہ یہ ہندی اور ہندوستانیت کا عالیشان نمونہ ہے۔''

(اردو شاعری پر قومی یکجہتی کے عناصر، سید مجاور حسین، ص: ۱۲۵)

''قطب مشتری'' میں وجہی نے اپنے وطن کی دلکشی اور رعنائی میں فنکارانہ مہارت دکھائی ہے اور خود کو محبِّ وطن کہا ہے۔

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں
بیچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ملک وہ کچ عجب ٹھانوں ہے
دکھن میں سو ایسا ہر ایک گاؤں ہے

وجہی نے اس مثنوی میں دکنی سخاوت، فراخ دلی اور انصاف پروری پر بھی روشنی ڈالی ہے:

عدل بخشش ہور دار اس تے اچھے
سدا خلق سب شاد اس تے اچھے
جتنے بادشاہ ہیں سنسار کے
بھکاری ہیں سب اس کے دربار کے

غواصی دبستانِ گولکنڈہ کا ایک ممتاز شاعر تھا۔ اس نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں شہرت حاصل کی اور بادشاہ نے اسے ''فصاحت آثار'' کے خطاب سے نوازا تھا۔ کلیات غواصی کو ڈاکٹر محمد بن عمر نے مرتب کر کے ۱۹۵۹ء میں شائع کیا۔ جس میں غزلیں، قصائد، مرثیے، رباعیات اور مثنویاں شامل ہیں۔ غواصی کی مثنویوں میں مشترکہ تہذیب وتمدن کے عناصر صاف نظر آتے ہیں۔ ''مینا ستونتی'' میں انھوں نے دو فرقوں، دو قوموں کی تہذیب اور زبان کے ساتھ تصورات وعقائد کو اس طرح مخلوط کیا ہے کہ انھیں ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ اس مثنوی کے سارے کردار ہندی ہیں مثلاً راجہ بالاکنور، چندرا، لورک اور مینا۔ مینا کے کردار میں جو شوہر پرستی کا جذبہ ہے وہ ہندی مذہب اور ادب کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ مینا ستونتی میں ''ستی'' ہونے کا جذبہ بھی نظر آتا ہے:

پرائی بھار کے کوں سناوے گلا
تو اس جائی کو موت آنا بھلا

غواصی نے ہندی لوک کتھا کو ہندی کردار اور اس کے ہندی عقائد و تصورات کے ساتھ اسلامی تہذیب و مذہب اور عقیدہ سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مثلاً:

ننھی کی مناجات اول قبول
ہے خوشنود اس پر خدا ہور رسول
خدا تج سے راضی نہ راضی رسول
جیتے جیو دوزخ کری تو قبول

غواصی کی دوسری مثنوی ''سیف الملوک وبدیع الجمال'' ہے۔ اس مثنوی میں بھی غواصی نے سنسکرت کہانی کے چند واقعات مستعار لیے ہیں۔

غواصی کی تیسری مثنوی ''طوطی نامہ'' ہے۔ اس مثنوی کا قصّہ سنسکرت کی مشہور تصنیف ''شکاسپ تنتی'' کے قصّہ پر مبنی ہے۔ صوفیوں اور سنتوں کی طرح غواصی نے بھی اخلاقی اقدار ابھارنے کے لیے مختلف رنگارنگ اور متنوع حکایات سے مدد لی ہے۔ ان حکایات پر عمل کرنے سے زندگی کا حسن نکھرتا ہے اور انسانیت اور تہذیب پر ایمان کی جڑیں مستحکم اور مضبوط ہو جاتی ہیں۔

عبداللہ قطب شاہ کے دوبار کے مشہور اور مقبول شعراء میں ابن نشاطی کا شمار ہوتا ہے۔ ابن نشاطی کی مثنوی ''پھول بن'' (۱۶۵۵ء) دبستان گولکنڈہ کا ایک زبردست فنی کارنامہ ہے۔ اس مثنوی کی بنیاد ایک فارسی قصّے ''بساتین الانس'' پر ہے۔ یہ محض ترجمہ نہیں بلکہ اس میں نشاطی کی فنکارانہ صلاحتیں اور مقامی ماحول کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ اس مثنوی میں نشاطی نے چھیاسٹھ موقعوں پر انتالیس صنعتیں استعمال کی ہیں۔

ہنر کوئی دکھاوے سو دکھایا
صنائع یک کم چالیس لایا

اس مثنوی میں پیش کردہ کردار مصری و ایرانی ہیں لیکن ان کے ناز وادا اور حسن وشباب ہندوستانی ہیں:

اتھی اس ٹھار ایک زاہد کو بیٹی
فرشتہ خوئی تس عابد کو بیٹی
چتر، چنچل، سرگ، کنول سہانی
نہ اس کوں کوئی تھا صورت میں ثانی

اس کے بعد بحری نے اپنی مثنوی ''من لگن'' میں فلسفۂ وحدت الوجود پر روشنی ڈالی ہے، تزکیۂ نفس کے طریقے بتائے ہیں اور اس سے ہونے والے فوائد کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کو سمجھانے کے لیے بحری نے فلسفۂ ویدانت کی مدد لی ہے۔ صوفی اور سنت دونوں کی تعلیم یہی ہے:

یک جھوٹ سو دو جہاں لرزتا
دھرتی سو مل آسماں لرزتا
غیبت نکوسن میری بناتی
غیبت کو برا رکھے زناتی
ہونا ہے جو دوست دھرم کا ہو
ہونا جو شریک شرم کا ہو

قطب شاہی عہد کی دیگر مثنویوں میں طبعی کی ''بہرام وگل اندام'' (۱۶۷۰ء)، احمد جنیدی کی ''ماہ پیکر'' اور فائز کی ''رضوان شاہ وروخ افزا'' قابل ذکر ہیں۔ فائز اس دور کا آخری شاعر تھا اور اس کی مثنوی بقول اشرف رفیع:

''یہ قطب شاہی دور کی آخری مثنوی اور دکنی اردو کو ریختہ سے ملانے والی پہلی مثنوی ہے۔''

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد عادل شاہی اور قطب شاہی عہد میں صنفِ مثنوی کو اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ اس میں مشترکہ تہذیب وتمدن اور سماجی زندگی کے ہر پہلو کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مثنویوں میں ہماری مشترکہ تہذیب اور ادبی وثقافتی زندگی کے لازوال مرقعے محفوظ ہیں۔

◆◆◆